میں اور میرا پاکستان

عمران خان

کپتان کی کہانی

بظاہر یہ ایک کھلاڑی اور سیاستدان کی کہانی ہے لیکن دراصل یہ ایک سپاہی کی داستان ہے۔ وہ آدمی جس نے کرکٹ، کینسر ہسپتال اور سیاست کی رزم گاہوں میں پیش آنے والے حادثات میں زندگی، اور خود کو دریافت کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش ابھی جاری ہے اور جاری رہنی چاہیے۔ تمام اندازے یہ ہیں کہ ابھی وہ غلطیاں کرے گا اور امید یہ بھی ہے کہ ابھی اسے بہت سے مزید کارنامے انجام دینا ہیں۔ سب سے بڑا معرکہ ابھی کچھ دن میں درپیش ہوگا..... اور اللہ کے آخری رسول ﷺ کا فرمان یہ ہے: کوئی اس دنیا سے اٹھے گا نہیں، جب تک اس کا ظاہر و باطن آشکار نہ ہو جائے۔ پروردگار اسے امان میں رکھے اور اس کی آنکھ اپنے آپ پر کھول دے۔ اللہ کا قانون کسی کے لیے بدلتا نہیں۔ جن کے رتبے سوا ہیں ان کی آزمائش بھی سوا ہوتی ہے۔

برطانیہ کا ایک دانشور یہ کہتا ہے کہ یہ طویل تحریر کمال ذہانت سے لکھی گئی۔ دوسرے کا خیال ہے کہ بالکل سادہ سے انداز میں..... دونوں باتیں درست ہیں اور پوری طرح درست۔ ہم جو اسے جانتے ہیں، اس راز سے خوب واقف ہیں کہ بے شک وہ ایک سادہ سا آدمی ہے لیکن گاہے

بہت غور و فکر کرنے والا بھی۔ سب دوسروں کی طرح وہ اسی وقت غلطی کا ارتکاب کرتا ہے، جب اپنے خیال کے سحر میں مبتلا ہو جائے اور کامران تب جب اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر فیصلہ کرے۔ صرف اپنے آپ پر نہیں، اللہ پر بھروسہ کرے۔

یہ اس کی اپنی کہانی ہے اور اتنی ہی پاکستان کی بھی، جس کی تخلیق کے پانچ برس بعد وہ پیدا ہوا۔ ایک آسودہ گھرانے کا اکیلا اور لاڈلا فرزند، زندگی جس پر مہربان تھی لیکن سب دوسروں کی طرح اپنے آپ سے اسے لڑنا تھا۔ دوسرے نیازی لڑکوں سے وہ کس طرح مختلف تھا اور کرکٹ کے دوسرے کھلاڑیوں سے؟ بارہا یہ سوال میں اس کے دوستوں اور بھائیوں سے اور باندازِ دگر خود اس سے بھی پوچھتا رہا۔ یہ بھی سوچتا رہا ایک عام اخبار نویس کی زندگی میں وہ کیسے داخل ہوا۔ اس جہان میں یہ ناچیز کیسے چلا گیا، جس سے کبھی اس کا واسطہ نہ تھا، جو آج بھی کرکٹ کی اصطلاحوں کو سمجھ نہیں پاتا اور شوکت خانم ہسپتال میں، جس کا ایک ذرا سا حصّہ بھی نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ منکشف ہوا، وہ اس لیے مختلف ہے کہ جھوٹ نہیں بولتا، روپے کی ہوس میں مبتلا نہیں ہوتا، ہمیشہ کا رجائیت پسند ہے اور جس کام میں ہاتھ ڈالے، اسے ادھورا کبھی نہیں چھوڑتا۔

شاید یہ 1981ء تھا، بزرگ کالم نگار عبدالقادر حسن کے ایک جملے نے مجھے اس کی طرف متوجہ کیا اور پھر وہ میری زندگی کا کبھی نہ الگ ہونے والا حصّہ ہو گیا۔ میں نے اس کے بارے میں چھپنے والی تقریباً ہر اس عبارت کو پڑھا جو پڑھ سکا اور اس کے بارے میں کی جانے والی ہر گفتگو کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کے خاندان، خاص طور پر اس کے عم زاد حفیظ اللہ خان سے میری ملاقات تھی جو بتدریج گہری بے تکلفی میں بدل گئی۔ حفیظ اللہ کی خوبی یہ ہے کہ وہ بلند آواز سے سوچتا ہے، خامی بھی یہی ہے۔ 1996ء میں پہلی بار، اس کے ساتھ میری مفصّل ملاقات ہوئی، جب جنرل حمید گل نے ایسا کرنے کا مشورہ دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ رفاقت گہری ہوتی گئی۔ ظاہر ہے کہ ہمیشہ اتفاقِ رائے نہ تھا خاص طور پر بعض عسکری امور اور شخصیات کے باب میں مگر اللہ

کے فضل سے باہمی اعتماد بے حد۔ وہ ایک مستقل مزاج آدمی ہے۔ تعلق اور اس کی نوعیت من مرضی سے استوار کرتا ہے لیکن پھر حتی الامکان بگڑنے نہیں دیتا۔ ادھر یہ ناچیز پرلے درجے کا متلوّن مزاج۔ اللہ کا شکر ہے کہ نبھ گئی اور خوب نبھی؛ اگرچہ برسوں پہلے عصر رواں کے عارف نے، جن کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہے، اور جو اسے بھی خوب جانتے ہیں، یہ کہا تھا: تم اس کے ساتھ شریک اقتدار نہیں ہو گے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ مجھے اس امتحان سے محفوظ رکھے اور اسے سرخرو کرے۔

1983ء میں، میں نے ایک مضمون لکھا کہ ایک دن وہ سیاست میں آئے گا۔ آج تک وہ حیران ہے اور میں خود بھی کہ یہ خیال مجھے کیسے سوجھا۔ تب اس سے میری ذاتی ملاقات تک نہیں تھی۔ درویش کا کہنا یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ خود نہیں لکھتا، گاہے اس سے لکھوا دیا جاتا ہے۔

جب اس کتاب کے ترجمے کا مرحلہ آیا تو بہت دن وہ میز پر پڑی رہی۔ انگریزی زبان پر میری دسترس محدود ہے لیکن کسی اور کو سونپنے پر طبیعت آمادہ نہ تھی۔ تجربہ کیا تو ناکام رہا۔ اوّلین مسوّدہ 2001ء میں لکھا گیا اور اب بھی میری لائبریری میں پڑا ہے لیکن پھر نائن الیون کا حادثہ ہوا تو اس نے نظرثانی کا فیصلہ کیا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ مکمل کر لکھ ڈالیں گے لیکن پھر فرصت عنقا ہو گئی۔ جولائی 2011ء میں ایک دن لگ بھگ چار سو صفحات کی مربوط کتاب اس نے میرے حوالے کی اور حیرت سے میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ کب اور کہاں اتنا وقت وہ نکال سکا؟ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز یہ کہ ایک ایک سطر میں وہ جھلکتا تھا۔ علاّمہ اقبال کی تحریروں کا اس قدر انہماک سے وہ کیسے مطالعہ کر سکا اور اس قدر واضح نتائج کیونکر اخذ کر سکا۔ رانا محبوب اختر بار بار مجھ سے پوچھتے: کیا یہ (فکرِ اقبال کا) باب اس نے خود لکھا ہے؟ زچ ہو کر میں نے عرض کیا: مدد ہی لینا ہوتی تو کیا مجھ سے بات نہ کرتا؟ وہ ایک حیران کن آدمی ہے، کسی بھی وقت، کچھ بھی اس سے سرزد ہو سکتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ غیر معمولی ذہانت کا آدمی ہے بلکہ اس لیے کہ اللہ نے عزم کی بے پناہی اسے

بخشی ہے۔ جس چیز سے محبت ہو جائے، اس کا ہو رہتا ہے۔ اقبال سے اُسے محبت ہے۔ ان کے خواب پاکستان سے بھی اتنی ہی شدید۔

2004ء کے بعد جب اس کی پارٹی بکھر گئی تھی اور جمائما بچوں کے ساتھ لندن میں جا بسی تھیں، شام کو فراغت اسے میسر ہوتی۔ راول جھیل کے مقابل بلندیوں پر بنے، حاسدوں کے سینے پر مونگ دلتے اس کے گھر کے اردگرد کھلے میدان میں کبھی ہم گھوما کرتے۔ برق کی طرح ایک خیال ایک دن ذہن میں چمکا۔ خان صاحب آپ خوش قسمت بہت ہیں۔ شوکت خانم ہسپتال کے لیے اللہ نے آپ کے ہاتھ میں کشکول پکڑا دیا ورنہ آپ ایک متکبر آدمی ہوتے۔ حیرت سے اس نے میری طرف دیکھا اور بچوں کی سی معصومیت سے بولا ''تم ٹھیک کہتے ہو۔''

جب یہ مکان زیرِ تعمیر تھا تو کبھی ایک ہلکی سی اداسی اس کے چہرے پر جھلک اٹھتی، جس کے لیے یہ گھر بنایا جا رہا تھا، اب وہ سات سمندر پار تھی۔ بچے اسے یاد آیا کرتے لیکن یہ دُکھ اس نے تنہا سہا اور بہت بعد میں اور سرسری طور پر بیان کیا۔ اتنے بڑے مکان میں وہ اکیلا کیسے رہے گا؟ تین کمرے کے فلیٹ میں وہ آسانی سے بسر کرتا تھا۔ جمائما نے کہا تھا کہ مکان کی تعمیر کے نصف اخراجات وہ ادا کرے گی، جسے قبول کرنے میں خوددار آدمی متامل تھا، لیکن اب وہ یہاں نہیں تھی۔ کبھی وہ اس مکان سے بیزار بھی ہو جاتا: ''مکان نہیں یہ ایک کنواں ہے، جس میں روپیہ گرتا رہتا ہے۔'' ایک بار اس نے کہا تھا۔ اپنی تمام زائد آمدن وہ ہسپتال اور یونیورسٹی کو دے دیتا ہے۔ وہ کبھی ایک فضول خرچ آدمی نہ تھا اور نمائش پسند تو ہرگز نہیں۔ میں نے کہا: اللہ، تمہیں روپے سے محروم نہ رکھے گا، جو بندوں کے میں کام میں لگا رہتا ہے، اس کے کام پروردگار کے ذمہ ہوتے ہیں۔ آئندہ چند ماہ کے دوران اسے دو لاکھ ڈالر سے زیادہ ملے اور پھر ملتے ہی رہے حتیٰ کہ عالمی کپ میں مبصر کی حیثیت سے نصف ملین ڈالر کی پیش کش ہوئی، جو اس نے مسترد کر دی۔ اس زمانے کے اور بہت سے واقعات بھی ہیں۔ میرے جی میں آتا ہے کہ ''کپتان کی

کہانی'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھ ڈالوں۔ کون جانتا ہے کہ لکھ پاؤں گا یا نہیں۔ اس کے باوجود کہ میری کوئی باقاعدہ ذمہ داری نہیں، وقت اب نہیں ملتا۔ کبھی تو وہ بھی تعجب سے کہتا ہے: تم تو عید کا چاند ہو گئے۔

پھر مکان مکمل ہو گیا اور ایک شام اس کے صحن میں ہم موجود تھے۔ ایک دن اس نے کہا ''اتنا بڑا گھر؟ یہ تو ایک وزیرِ اعظم ہی کو زیبا ہے۔'' بے اختیار میری ہنسی چھوٹ گئی۔ میں نے کہا تاریخ میں شاید یہ پہلی بار ہو گا کہ ایک مکان کی خاطر ایک شخص کو وزیرِ اعظم بنایا جائے۔ حسِ مزاح اس کی بہت اچھی ہے مگر اس روز وہ نہ ہنسا۔ اس میں لاہوریوں والی بے باکی نہیں۔

عمران خان کی سب سے بڑی کامیابی کیا ہے؟ کرکٹ کا عالمی کپ؟ جس کی وجہ سے اس کا نام کھیل کی عالمی تاریخ میں رہے گا کہ ڈیڑھ سو برس کا سب سے اچھا کپتان کہلایا؟ شوکت خانم ہسپتال جو شاید ایک دن تاج محل سے بڑی داستان ہو جائے؟ کیا وہ کارنامہ جو غالباً ابھی انجام دینا ہے؟ نہیں میرا خیال ہے کہ اس کی سب سے بڑی کامرانی ہستی باری تعالیٰ کا ادراک تھا۔ میرے خیال میں اللہ کی آرزو میں اس کا سفر اس کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے اور اسی کو سب سے زیادہ توجہ کے ساتھ پڑھا جانا چاہیے۔ اس سمندر کا صدف یہی ہے۔ مغرب کے اس نادر روزگار صوفی بایزید نے جسے راہِ سلوک کے چار بڑوں میں سے ایک مانا جاتا ہے، یہ کہا تھا: چالیس برس میں نے اللہ کو تلاش کیا، جب میں نے اسے پایا تو دیکھا کہ وہ میرے انتظار میں تھا۔ پروردگار کا دروازہ ہمیشہ چوپٹ کھلا رہتا ہے لیکن اس کی تلاش میں نکلتا کون ہے؟ پھر جو نکلتے ہیں کیا ان کی اوّلین ترجیح، صداقتِ کاملہ کی تلاش ہوتی ہے؟ میری موجودگی میں پروفیسر احمد رفیق اختر نے کپتان سے پہلی ملاقات میں یہی سوال پوچھا تھا۔ درحقیقت ان دونوں کے درمیان یہی جملہ گفتگو کا آغاز تھا۔ خان نے جواب دیا: میری سیاست، صرف پاکستان نہیں، عالم اسلام کے لیے ہے۔ میری رائے میں اس سوال اور اپنے جواب پر اسے غور کرتے رہنا چاہیے۔ بعض پہلو ابھی جواب چاہتے ہیں۔ صرف اظہار میں نہیں، عمل میں بھی۔